ملّتِ اسلامیہ کا فقہی سرمایہ

(ڈاکٹر معروف دوالیبی پروفیسر قانون اسلامی لاء کالج، شام)

عہدِ صحابہؓ کے بعد امّت میں علوم و فنون کی تدوین کی جو حیرت انگیز تحریک اُٹھی، اُس نے اگرچہ زندگی کے ہر گوشے پر علوم و معارف کے انبار لگا دیئے۔ مگر امت کو سب سے زیادہ جس شعبۂ علم سے فائدہ پہنچا وہ اسلامی قانون کا شعبہ ہے۔ فقہائے اسلام نے اس شعبے میں جو تحقیقی و تالیفی سرگرمیاں دکھائی ہیں اور قانونی مواد پر مشتمل جو قابلِ قدر اور بافراط ذخیرہ مستقبل کی نسلوں کی طرف منتقل کیا ہے اُس کی نظیر دوسری کسی قوم کی تاریخ سے مہیا نہیں کی جا سکتی اور نہ کسی دوسری قوم کا علمی و قانونی ورثہ اس کے مقابلے میں رکھا جا سکتا ہے۔ شعبۂ قانون کی ترقی و شادابی اور اس سے علماء کا خیر معمولی شغف دراصل تین بنیادی عوامل کا رہینِ منّت ہے۔

پہلا بنیادی عامل اجتہاد ہے۔ شریعت اسلامی نے شروع ہی سے اجتہاد کو قانون کے ماخذ اور مصادر کے دائرے میں شامل کر لیا تھا۔ اور اس کے اختیارات اسلامی حکومت کی آزاد عدلیہ اور فقہائے اسلام کی خداداد صلاحیتوں کو تفویض کر دیئے تھے۔ شریعتِ اسلامی کا یہ فیصلہ فطری تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے کی وجہ سے تحقیق و تدقیق اور بحث و نظر کے راستوں کو کھولنے کا بہت بڑا محرّک ثابت ہوا۔ اور اس نے ہر فقیہ اور ہر قانون دان کے اندر یہ ولولہ پیدا کر دیا کہ وہ اپنے اجتہادات اور نتائجِ تحقیق کو جامۂ تدوین و ترتیب پہنائے۔ اجتہاد اور قیاس کی بساط لپٹ جانے کا دور بہت بعد کا ہے۔ جس دور کی بات ہم کر رہے ہیں ـــــ اور وہی دراصل ہمارے فقہی و قانونی سرمائے کے توسّع کا دور ہے ـــــ اس وقت علماء اور حاملینِ فقہ کی جانب سے کبھی یہ کوشش نہیں کی گئی

کہ وہ اجتہاد کے دروازے پر تالے چڑھا دیں۔ اور لوگوں کو صرف ایک مخصوص مذہب کی پیروی پر مجبور کریں۔ اور اُس علمی تحریک کے روز افزوں پھیلاؤ کو روک دیں جس کے برگ و بار سے آج تک امت نہ صرف محظوظ ہو رہی ہے بلکہ دوسری اقوام کے سامنے اُس کا سر فخر بلند ہے۔ اس کے برعکس ہمیں ایسی مثالیں ملتی ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی وقت "وحدتِ مذہب" کا خیال نوکِ زبان پر لایا ہے تو خود فقہاء نے اس کی مخالفت کی ہے۔ اس وقت ہمارے سامنے اس کی دو بیّن مثالیں موجود ہیں:-

۱۔ مسندِ خلافت پر متمکن ہونے کے بعد عباسی خلیفہ منصور جب حج کو گیا تو وہاں امام مالک سے اُس کی ملاقات ہوئی۔ امام مالک فرماتے ہیں کہ اس وقت منصور نے مجھ سے کہا: میں نے پختہ نیت کر لی ہے کہ آپ کی تصنیف (مؤطا) کی نقلیں کروا کر مسلمانوں کے ہر شہر میں ایک ایک نقل بھیج دوں اور حکم جاری کر دوں کہ لوگ اس کے احکام پر عمل کریں اور اس کے سوا کسی کی طرف رجوع نہ کریں"۔ میں نے کہا: امیر المومنین! آپ کا یہ خیال درست نہیں ہے۔ لوگوں کے اندر پہلے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کے اقوال جاری و ساری ہیں۔ ان کی زبانوں پر مختلف احادیث کا چرچا ہے۔ اور ہر گروہ اپنے انہی احکام و فتاویٰ پر قائم ہے جو صحابۂ کرام سے وراثتہً اُن تک پہنچے ہیں۔ ایسی حالت میں لوگوں کے اختیار کردہ مسلک سے تعرض کرنا مناسب نہیں ہے"۔

۲۔ امام مالک ہی سے ایک دوسری روایت ہے جسے ابونعیم نے حلیہ میں بیان کیا ہے۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ "ہارون الرشید نے مجھ سے مشورہ طلب کیا کہ وہ چاہتا ہے کہ مؤطا کو خانۂ کعبہ میں آویزاں کرے اور تمام مسلمانوں کو فقہی احکام میں اس کی پیروی پر مجبور کرے۔ لیکن میں نے جواب دیا کہ "ایسا نہ کرو، خود صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اندر جزئیات و فروعات میں اختلافات برپا تھا۔ اور وہ اسی حالت میں مختلف شہروں میں پھیل گئے اور اُن میں سے ہر شخص راہِ صواب پر تھا"۔

دوسرا بنیادی عامل، جو ہمارے قانونی اور تشریعی ذخیرے کے اندر تعجب خیز فراوانی اور بہتات کا موجب ہوا ہے، یہ تھا کہ اسلامی سلطنت کے وسیع و عریض اطراف میں بیک وقت اجتہادی قوتیں سرگرم عمل تھیں۔ اور اندلس سے لے کر حدودِ چین تک مجتہدین کی مجالسِ درس پھیلی ہوئی تھیں۔ چونکہ ہر خطے کے باشندے جُدا جُدا عادات و مزاج رکھتے تھے۔ ہر ایک کی اقتصادی و تمدنی ضروریات دوسرے سے مختلف تھیں، اس وجہ سے ہر خطے کے لوگ لاتعداد ایسے مسائل و معاملات سے دوچار تھے جن کے بارے میں کتاب اللہ یا سنتِ رسولؐ سے اُن کے پاس کوئی رہنمائی نہ تھی۔ چنانچہ وہاں کے علماء کو ضرورت محسوس ہوئی کہ ایسے مسائل و معاملات کے بارے میں اپنی اجتہادی بصیرت سے کام لیں اور کتاب و سنت سے ان کے احکام مستنبط کریں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر خطہ میں تخریجِ احکام اور استنباطِ مسائل کا عمل جاری ہو گیا اور اس طرح عالمِ اسلامی کے ہر بڑے شہر میں فقہ اسلامی کا مرکز وجود میں آگیا۔ حدودِ چین کی طرف افغانستان، ایران میں نیشاپور، عراق میں بغداد، کوفہ اور بصرہ، شام میں دمشق اور حمص، حجاز میں مدینہ اور مکہ، مصر میں فسطاط، تونس میں قیروان، اندلس میں قرطبہ، غرناطہ اور طلیطلہ کے تاریخی شہر ائمۂ مجتہدین اور بالغ نظر مقننین کے وجود سے مالا مال رہے ہیں۔ ان عواصم (CAPITALS) کے علاوہ چھوٹے چھوٹے شہروں کی تعداد احاطۂ شمار سے باہر ہے جہاں مدتِ مدید تک تحقیقات و تخریجات کے چشمے اُبلتے رہے ہیں اور امت کی کھیتی کو سیراب کرتے رہے ہیں۔

اسی طرح فقہی ثروت میں اضافے اور ازدیاد کا باعث حج کا عالمگیر اجتماع بھی تھا۔ دورِ اجتہاد میں علماء کی معتد بہ تعداد اسلامی سلطنت کے اطراف و اکناف سے جمع ہو کر ہر سال حج کے لیے آتی۔ اور اس سے مکہ اور مدینہ میں سال بہ سال علمی کانفرنس کا انعقاد ہوتا رہتا تھا۔ جس میں ہر صاحبِ علم اپنے اپنے علمی افکار، اجتہادی آراء اور اپنے ملک کے پیش آمدہ مسائل دوسروں کے سامنے رکھتا تھا۔ ان پر تبادلۂ خیالات ہوتا۔ مذاکرات و مباحثے

ہوتے۔ ایک خطہ کے علماء کو دوسرے خطے کے علماء کے خیالات و آراء سے مستفید ہونے اور ہر ایک کو اپنے اپنے حالات کے مطابق مسائل و احکام اختیار کر لینے کا موقع ملتا۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ایسی عالمگیر سالانہ علمی کانفرنسیں، جو حج کے طفیل منعقد ہو جایا کرتی تھیں، کتنے عظیم اثرات کی حامل ہوتی تھیں۔ اور انہوں نے مجتہدانہ دقت رسی اور فقہی تالیف و تصنیف کی تحریک کو فروغ دینے میں کتنا حصہ لیا ہے؟

ان تین اساسی محرکات کے فیض سے مسلمان قوم کے اندر اسلامی قانون کے لٹریچر کی بڑی بڑی الماریاں وجود میں آگئیں۔ ان الماریوں میں مشرق سے لے کر مغرب تک کی گوناگوں اجتہادی صلاحیتوں، تفقہ و استنباط کے نتھرے ہوئے ذوق اور تشریع و تقنین کے ملکہ سے بہرہ مند طبائع کے نتائجِ تحقیق، جنہیں ہم موجودہ اصطلاح میں قانونی نظائر سے تعبیر کرتے ہیں، مجموعوں کی شکل میں موجود ہیں۔ اور صرف ایک ملک میں نہیں، بلکہ قدیم دنیا کے تینوں براعظموں میں ان جواہرات کی بہتات ہے۔ ان مجموعوں میں جس کثرت کے ساتھ احکام و مسائل کو جمع کیا گیا ہے اور ان پر جس قدر سیر حاصل اور ہمہ پہلو بحثیں کی گئی ہیں اُس کی نظیر دنیا کے کسی قانونی لٹریچر میں نہیں ملتی۔ اس قانونی لٹریچر کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اگرچہ یہ مختلف ممالک کے مقننین اور اربابِ اجتہاد کی کاوشوں پر مشتمل ہے اور مختلف طبائع اور متضاد ذوق اس کی تخلیق کرتے رہے ہیں، بایں ہمہ آج ہمارے سامنے وہ اس صورت میں ہے کہ گویا یہ ایک ہی دارالضرب کے سکے ہیں اور ایک ہی کاریگر کے ہاتھ نے ان کی تراش خراش کی ہے۔

جگہ کی قلت میرے راستے میں حائل ہے ورنہ میں کتب خانۂ اسلام کی کم از کم ان اہم اور نفیس ترین کتابوں سے قارئین کرام کو روشناس کراتا جو آج تک ہمارے عظیم المرتبت علماء کے قلم سے نکلی ہیں۔ اس لیے میں اس خیال سے قطعِ نظر کر کے صرف یہ بیان کرنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ یہ کتب خانہ ترتیب و تدوین اور موضوعِ بحث کے لحاظ سے کتنی اقسام پر مشتمل ہے۔

تمام فقہی کتابوں اور قانونی مجلّوں کو نوعیتِ ترتیب کے لحاظ سے ہم سات قسموں میں

تقسیم کر سکتے ہیں۔ ان میں سے پہلی قسم میں وہ مجموعے شامل ہیں جن میں احکام کو احادیث و آثار کے ضمن میں بیان کیا گیا ہے۔ اور ان کی ترتیب احکامِ فقہیہ کی ترتیب کے لحاظ سے رکھی گئی ہے۔ اور انہیں ابواب و فصول کے تحت درج کیا گیا ہے۔ اور بعض ابواب کے آخر میں مؤلف نے احادیث و آثار کے ذکر کے بعد بعض ایسے احکام و وقائع بھی درج کر دیئے ہیں جو اس کے نزدیک اس باب کے اشباہ و نظائر (PRECEDENTS) کی حیثیت رکھتے ہیں یا ان پر اپنے فقہی قواعد کی رُو سے حکم لگایا ہے۔ اس طرح کے مجموعوں میں عمدہ ترین مجموعہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا ہے جسے امام موصوف نے "مؤطا" کا نام دیا ہے۔

دوسری قسم میں عام فقہی کتب داخل ہیں، جن میں احادیث و آثار کو بیان نہیں کیا گیا بلکہ صرف فقہی احکام کا ذکر ہے۔ اور مؤلف نے ان احکام کو ابواب و فصول کے ضمن میں اپنے فقہی مسلک کے مطابق بیان کیا ہے۔ اس طرز کی بہترین کتاب المبسوط ہے۔ یہ کتاب اپنے مواد و مطالب کے لحاظ سے بڑی بلند پایہ ہے۔ اور چھ ضخیم جلدوں میں ہے۔ اسے امام ابوحنیفہ کے شاگرد امام محمد بن حسن شیبانی نے تالیف کیا ہے۔ امام محمد نے اس میں لاکھوں کی تعداد تک مسائل جمع کر دیئے ہیں۔ ان میں سے ہزاروں مسائل وہ ہیں جن کے جوابات امام ابوحنیفہ نے مستنبط کیے ہیں اور ہزاروں ایسے ہیں جن میں صاحبین (امام ابو یوسف اور امام محمد) نے اپنے استاذ امام ابوحنیفہ سے اختلاف کیا ہے۔ کتاب کی تدوین میں مؤلف موصوف نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ کسی باب کو جب وہ شروع کرتے ہیں تو سب سے پہلے اُن احادیث و آثار کو لاتے ہیں جو اس باب سے متعلق ان کے پاس ہوتے ہیں۔ پھر ان سے مستخرج ہونے والے مسائل بیان کرتے ہیں۔ اور بالعموم باب کا خاتمہ ان مسائل پر کرتے ہیں جن میں امام ابوحنیفہ اور ابن ابی لیلیٰ نے اختلاف کیا ہے۔ احکام کی علتوں اور توجیہات کے ذکر سے یہ کتاب خالی ہے۔

تیسری قسم کتبِ آثار کی ہے۔ جن میں مختلف مذاہب کے علماء نے اپنے مذہب کے ایسے

تمام آثار جمع کر دیئے گئے ہیں جن سے اس مذہب کے ائمہ نے احکام و فروع میں استدلال کیا ہے۔ امام محمد کی کتاب الآثار اسی نوعیت کی ہے۔ انہوں نے اس میں وہ تمام آثار درج کر دیئے ہیں جن سے آئمۂ احناف استدلال کرتے ہیں۔

چوتھی قسم ان کتابوں کی ہے جن میں مسائل پر علمی حیثیت سے تنقید کی گئی ہے۔ اور مؤلفین نے ان میں اپنے مخالفین کے مسالک و آراء کا تجزیہ و تحلیل کر کے اُن کی کمزوریوں کو نمایاں کیا ہے اور اپنے مذہب کی صحت و صواب کے وجوہ واضح کیے ہیں۔ امام محمد کی کتاب "الرد علیٰ اہل المدینۃ" اسی طرز کی کتاب ہے۔ یہ انہوں نے اہلِ مدینہ کے رد میں لکھی ہے اور اس میں ان مسائل پر بحث کی ہے جن میں امام ابو حنیفہ نے اہلِ مدینہ کی مخالفت کی ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے بھی اپنی کتاب "الام" میں اس کو روایت کیا ہے۔ اور اس کے ہر مسئلہ پر تعقیب کر کے اس میں یا تو اہل مدینہ کی تائید کی ہے یا امام ابو حنیفہ کی رائے سے موافقت کی ہے یا دونوں کی تردید کی ہے۔ میری نگاہ میں قانونی نقد و جرح کے موضوع پر اس سے بہتر کوئی کتاب نہیں ہے۔ اس کتاب سے قانون کے طالب علم کو نہ صرف مختلف فیہ احکام اور ان پر تنقید کرنے کا اسلوب ہی معلوم ہو گا بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کتاب اس کے اندر قانونی نکتہ رسی کا ذوق بھی پیدا کر دے گی۔ اور یہ بات فقہ و قانون کی دوسری کسی کتاب سے حاصل نہیں ہوتی۔ مثال کے طور پر ہم آپ کے سامنے کتاب کا ایک باب نقل کرتے ہیں جس سے پوری کتاب کا انداز معلوم کرنے میں آسانی ہو جائے گی۔ اس باب میں اس امر پر بحث کی گئی ہے کہ ایک شخص ایک دوسرے شخص کو پکڑ رکھتا ہے اور ایک تیسرا شخص اُسے قتل کر دیتا ہے۔ اب معلوم یہ کرنا ہے کہ قانون کی نگاہ میں پکڑ رکھنے والے کی حیثیت کیا ہے۔ اور یہ واضح ہے کہ وہ قاتل نہیں ہے بلکہ قاتل کے لیے معاون ہے۔

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا قول یہ ہے کہ پکڑ رکھنے والے پر قصاص نہیں ہے۔ قصاص صرف قاتل پر ہے۔ البتہ پکڑ رکھنے والے کو اذیت ناک سزا دی جائے گی اور اُسے جیل میں

(باقی صفحہ پر)

ڈالا جائے گا۔

اہلِ مدینہ کی رائے یہ ہے کہ پکڑ رکھنے والے کو اگر قاتل کے ارادۂ قتل کا علم تھا تو دونوں پر قصاص لازم آئے گا۔

امام محمد بن حسن کہتے ہیں کہ "پکڑ رکھنے والے کو کیونکر قتل کیا جائے گا؟ جب کہ فعل قتل اس نے نہیں کیا ہے"۔ امام محمد اپنی رائے پر تفصیلی بحث کرتے ہیں اور اپنے مخالفین سے استفسار کرتے ہیں کہ "اگر پکڑ رکھنے والا (مُمسک) قاتل کے بارے میں سمجھتا ہو کہ اس کا ارادہ قتل کا نہیں ہے تو کیا تم لوگ اسے واجب القتل ٹھہراؤ گے۔ اگر تمہارا جواب یہ ہے کہ اُسے قاتل کے ارادۂ قتل سے لاعلم ہونے کی صورت میں قتل نہیں کریں گے بلکہ اُس وقت قتل کریں گے جب کہ وہ یہ خیال (ظن) رکھتا ہو کہ قاتل ارادۂ قتل سے آیا تھا تو تمہارے اس قول کا مطلب یہ ہوا کہ تمہارے نزدیک مقتول کو پکڑ رکھنے والا محض گمان کی بنا پر مستوجبِ قصاص ہے۔ حالانکہ گمان غلط بھی ہوتا ہے اور یہ صحیح بھی" (اس کے بعد

امام محمد اس رائے کی غلطی کو متعدد مثالوں سے بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں) :

"میں آپ حضرات سے دریافت کرتا ہوں کہ دلالتِ قتل کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے ؟ یعنی ایک شخص قاتل کو مقتول کا سُراغ دیتا ہے۔ اور قاتل جا کر اُسے قتل کر دیتا ہے۔ دلالت کنندہ کو یہ بھی معلوم ہے کہ اگر اس کا بس چل گیا تو ضرور اُسے قتل کر دے گا۔ کیا آپ حضرات پکڑ رکھنے والے پر قیاس کر کے دلالت کنندہ کو بھی واجب القتل ٹھہرائیں گے ؟ اسی طرح ایک شخص دوسرے شخص کو حکم دیتا ہے کہ فلاں کو قتل کر دو اور وہ اُسے جا کر قتل کر دیتا ہے تو کیا قاتل اور حکم دینے والا دونوں پر قصاص نافذ ہوگا ؟ علیٰ ہذا القیاس ایک شخص نے ایک عورت کو کسی دوسرے شخص کی خاطر محبوس رکھا اور اس نے اُس کے ساتھ زنا کا ارتکاب کیا تو کیا حابس اور زانی دونوں پر حدِ زنا جاری ہوگی اور مُحصن ہونے کی صورت میں دونوں کو رجم کیا جائے گا یا صرف وہ شخص مستحقِ حد ہوگا جس نے زنا کا ارتکاب کیا ہے ؟ جو حضرات واقعۂ قتل میں مُمسک (پکڑ رکھنے والے) کو بھی واجب القتل قرار دیتے ہیں، اُن کے نزدیک تو واقعۂ زنا میں حابس اور زانی دونوں مستحقِ حد ہوں گے۔ ایسے ہی ایک شخص نے دوسرے کو شراب پلائی تو کیا صرف شارب پر حدِ خمر جاری کی جائے گی یا شارب اور ساقی دونوں اس کی لپیٹ میں آئیں گے۔ ایسے ہی ایک شخص کسی کو یہ حکم دیتا ہے کہ تم فلاں پر تہمتِ زنا لگاؤ اور وہ اُس پر افترا پردازی کر دیتا ہے تو کیا فقط قاذف پر حدِ قذف کا اطلاق ہوگا یا دونوں پر ہوگا۔ اہلِ مدینہ کے خیال کی رو سے دونوں پر حد واجب ہونی چاہیے۔" (ان مثالوں کے بعد امام محمدؒ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کا ایک اثر بروایتِ عطاء ابن ابی رباح نقل کرتے ہیں کہ) حضرت علیؓ نے ایک مقدمۂ قتل میں، جس میں ایک شخص قتلِ عمد کا ملزم تھا اور دوسرا مقتول کو روکے رکھنے کا، یہ فیصلہ صادر فرمایا تھا کہ "قاتل کو قتل کیا جائے اور دوسرے کو حبسِ دوام کی سزا دی جائے یہاں تک کہ وہ حالتِ قید ہی میں مر جائے۔"

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں : اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو نفسِ فعل کے ارتکاب پر سزا دی ہے

اور اسی کے لیے قصاص مقرر فرمایا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے ان ارشادات میں قصاص کا حکم فعلِ قتل پر ہے: کتب علیکم القصاص فی القتلٰی (مقتولین کے بارے میں تم پر قصاص فرض کیا گیا ہے)، وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِیِّہٖ سُلْطٰنًا (اور جو شخص ظلم سے مارا گیا ہم نے اُس کے وارث کو مطالبۂ قصاص کا اختیار دیا ہے)۔ دوسری آیت کے نزول کے وقت جو لوگ اس کے مخاطب تھے اُن میں یہ معروف اور مسلّم تھا کہ مقتول کا وارث صرف قاتل سے مطالبۂ قصاص کا اختیار رکھتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ: من اعتبط مسلمًا بقتل فھو قود ید ہ (جس نے کسی مسلمان کا ناحق خون بہایا تو اب اس کی جان مقتول کے ہاتھ میں ہے)۔ نیز ان آیات سے بھی واضح ہے کہ حدِّ زنا اور حدِّ قذف صرف زنا اور قذف کے جرم کا ارتکاب کرنے والوں پر نافذ ہو گی: الزانیۃ والزانی فاجلدوا کل واحد منھما مائۃ جلدۃ (زانی عورت اور زانی مرد، دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو) والذین یرمون المحصنٰت ثم لم یأتوا باربعۃ شھداء فاجلدوھم ثمانین جلدۃ (اور جو لوگ پاکدامن عورتوں پر تہمت لگائیں، پھر چار گواہ لے کر نہ آئیں، ان کو اسّی کوڑے مارو)۔ میں نے خلقِ خدا میں سے کوئی ایسا پیشوا یا صاحبِ امر نہیں دیکھا جس نے کسی شخص کو ایسے فعل یا ایسے قول (افتراء) پر حد ماری ہو جو اُس نے خود نہ کیا ہو یا اُس کی زبان سے نہ نکلا ہو۔ اس لیے اگر ایک شخص قتل کرنے کا مجرم ہے اور دوسرا مقتول کو محبوس رکھنے کا، تو قاتل کو فیصلۂ الٰہی کے مطابق قتل کیا جائے گا اور پکڑ رکھنے والے کو سزا دی جائے گی۔ خدا کے فیصلے میں یہ جائز نہیں ہے کہ جب میں قاتل کو اس کے فعلِ قتل کی پاداش میں قتل کر دیتا ہوں تو محبوس کرنے والے کو اس کے فعلِ حبس پر قتل کر دوں۔ حالانکہ حبس اور قتل دو مختلف فعل ہیں۔ جس نے حابس پر قصاص نافذ کیا اُس نے اللہ کے حکم کو بدل ڈالا۔ کیونکہ اللہ کا حکم یہ ہے کہ کتب علیکم القصاص فی القتلٰی۔ تو قصاص یہی ہے کہ آدمی کے ساتھ وہی کچھ کیا جائے جو اُس نے کیا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا اُس نے قتل کیا ہے جس کے بدلے میں اُس کے

ساتھ وہی برتاؤ کیا جائے گا یعنی قتل کیا جائیگا۔ وہ شخص جسِ مقتول کا مجرم ہے اور جس معصیت ہے اس پر تعزیر تو دی جا سکتی ہے قصاص جاری نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ اگر حبسِ قتل کا قائم مقام ہو اس کی صورت یہ ہے کہ حابس نے کسی شخص کو قصداً اس لیے محبوس کر رکھا ہو کہ اُسے قتل کیا جائے تو ایسی حالت میں چاہیے محبوس کو قتل نہ بھی کیا جائے، حابس واجب القتل ہوگا کیونکہ اُس کا یہ فعل قتل کی نیت پر مبنی تھا اور نیتِ قتل نے اُسے قتل کے مرادف کر دیا۔ یہ امام مالک بن انس اور محمد بن حسن کے قول کے خلاف ہے۔

"محمد بن حسن نے امام مالک پر جو اعتراضات وارد کیے ہیں، بلاشبہ وہ تمام اعتراضات بلکہ اُن سے زیادہ امام مالک پر وارد ہوتے ہیں۔ لیکن محمد بن حسن بھی اس غلطی سے محفوظ نہیں رہ سکے اور ایک دوسرے موقع پر وہ خود بھی امام مالکؒ کے قول کی بیان کردہ خامیوں اور تقاضوں میں سے اکثر سے ملوث ہو گئے ہیں۔ اور وہاں وہ تمام دلائل جو انہوں نے امام مالک کے خلاف قائم کیے ہیں بعینہٖ ان کے خلاف قائم ہو جاتے ہیں۔ وہ موقع یہ ہے کہ امام محمد کا قول ہے کہ اگر رہزنوں کی ایک جماعت نے مسافروں پر ڈاکہ مارا اور قتل و غارت کا بازار گرم کیا۔ اور اس جماعت کے ساتھ معاونین کا ایک گروہ ہے جو شور و ہنگامہ کو سن رہا ہے لیکن قاتلین کو نہیں دیکھ رہا ہے تو قاتلین اور غیر قاتل معاونین دونوں کو تیغ زد کیا جائے گا۔ قاتلین جرمِ قتل کی وجہ سے موردِ قصاص ٹھہریں گے اور غیر قاتل معاونین کو اس لیے قتل کیا جائے گا کہ قاتلین نے اُن کی قوت سے کشت و خون کا بازار گرم کیا۔ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے محمد بن حسن سے دریافت کیا کہ آپ کو اس بارے میں کوئی روایت بھی ملی ہے؟ انہوں نے کسی روایت کا ذکر نہ کیا۔ میں نے کہا: آپ کا کیا خیال ہے کہ ایک کمزور شخص ایک طاقتور شخص کو قتل کرنا چاہتا ہے اور وہ ایک دوسرے طاقتور شخص سے کہتا ہے کہ اگر میں ناتواں نہ ہوتا تو فلاں کو موت کے گھاٹ اتار دیتا۔ طاقتور شخص اس سے کہتا ہے کہ چلو میں تمہیں اس کی مشکیں باندھ دیتا ہوں۔ چنانچہ وہ اُس کی مشکیں کس دیتا ہے اور اُس کے سینے پر سوار ہو کر اس کا گلا ناتواں شخص کے آگے کر دیتا ہے۔ اور وہ اُسے چھری سے ذبح کر دیتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ ——— اہلِ مدینہ کے مسلک کے برخلاف ——— صرف ذبح کرنے والے پر حکم

قتل لگائیں گے۔ کیونکہ فعلِ قتل اُس کے ہاتھوں سرانجام پایا ہے۔ اور اُس شخص کی مدد کی جانب توجہ نہیں دیں گے جو قتل کا سبب تھا۔ کیونکہ فعل اور سببِ فعل دو مختلف چیزیں ہیں۔ خدا صرف فعل پر انسانوں سے مواخذہ کرتا ہے۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ مذکورہ دونوں صورتوں میں قتل پر کس کا تعاون زیادہ مؤثر اور کارگر ہے۔ کیا راہزنوں کے لیے مددگار گروہ کا یا نابینا شخص کے لیے طاقتور کا؟ پھر آپ یہ بھی فرماتے ہیں کہ اگر راہزنوں کا معاون گروہ ڈاکوؤں کو قتل و غارت کرتے دیکھ رہا ہو اور ان کو مدد پہنچا رہا ہو، لیکن اگر وہ آواز نہیں سن رہا ہے تو مستوجبِ قتل نہیں ہوگا، بلکہ مستوجب تعزیر ہوگا۔ تو میں کہتا ہوں کہ آواز سن لینے کی صورت میں کیا خصوصیت پیدا ہوگئی ہے کہ آپ اُس پر حدِ قصاص جاری کر دیتے ہیں اور فعلِ سماعت کو فعلِ قتل کے برابر شمار کر لیتے ہیں؟ اس پر امام محمد بن حسن کہنے لگے کہ "آپ کے ساتھی مالک بن انسؒ بھی معاون گروہ کے بارے میں میری رائے سے متفق ہیں"۔ میں نے کہا: جب آپ کا قول حجت نہیں ہے تو امام مالک کے اتفاق سے آپ کا قول دوسروں کے لیے کیونکر حجت بن سکتا ہے؟ یا خود ہمارے ساتھی امام مالک کا اسی قسم کا قول ہی کیسے حجت بن سکتا ہے؟ محمد بن حسن نے پوچھا: تو کیا آپ کی یہ رائے نہیں ہے۔ میں نے کہا: نہیں، اور نہ ہی کسی معقول آدمی کو اس رائے کے حق میں پاتا ہوں۔ ایسی رائے رکھنے والا علم و عقل کے دائرے سے خارج ہو جاتا ہے"۔

الغرض یہ پوری کتاب اسی طرز پر ہے اور اس کا ہر مسئلہ اسی قسم کے دلچسپ اور معنی آفرین مناقشات اور فریقین کے پُرزور استدلالات کا مرقع ہے۔ ہمارے سرمایۂ قانون میں یہ کتاب بڑی قدر و قیمت کی حامل ہے۔ اور اس لائق ہے کہ قانون کا ہر طالب علم اور اس فن سے مہارت رکھنے والا ہر شخص اس کے مطالعہ سے محروم نہ ہونا چاہیے۔

پانچویں قسم ان کتابوں کی ہے جن میں مختلف مدارسِ فقہیہ کے احکام و مجتہدات کا موازنہ کیا گیا ہے۔ بعض کتابوں میں یہ موازنہ تمام فقہی مسلکوں کے مابین کیا گیا ہے اور بعض میں صرف دو

یا تین مسلکوں تک محدود ہے۔ اس قسم کی کتابوں کی نوعیت وہی ہے جو جدید علمِ قانون میں قانون کے تقابلی مطالعہ کی کتابوں کی ہے۔ امام محمد کی مؤطا کو اس نوعیت کے قانونی لٹریچر میں سرِ فہرست رکھا جا سکتا ہے۔ مؤلف موصوف نے یہ مؤطا امام مالک رحمہ اللہ سے روایت کی ہے۔ امام مالکؒ کی مؤطا کا اس میں جائزہ لیا ہے۔ ان کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے وہ مؤطا کی احادیث کو نقل کرتے ہیں اور اس کے بعد وہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا مخالف یا موافق عمل نقل کرتے ہیں۔ اور اگر امام صاحب کا عمل ان کے خلاف ہو تو وجوہِ اختلاف پر بحث کرتے ہیں۔ عام فقہائے کرام میں شروع سے قانون کے تقابلی علم میں بڑا شغف و انہماک اور اہتمام پایا جاتا ہے۔ بلکہ اس نوعِ علم میں ان کی دلچسپیوں کا یہ حال رہا ہے کہ "علم الاختلافات" کے نام سے فقہ کے اندر ایک مستقل فن وجود میں آگیا ہے۔ جس میں مذاہبِ اربعہ کے آراء و اقوال کا موازنہ کیا جاتا ہے۔ وجوہِ اختلاف اور مآخذ استدلال کی تحقیق کی جاتی ہے اور اس کے حسن و قبح پر بحثیں کی جاتی ہیں۔ اس فن میں سب سے زیادہ جس کتاب نے شہرت حاصل کی ہے وہ "بدایۃ المجتہد" ہے، جو قرطبہ کے قاضی فیلسوفِ اسلام ابن رشد کی تالیف ہے۔

فنِ قانون پر بے نظیر تالیفات میں سے چھٹی قسم میں وہ عظیم ذخیرۂ کتب آتا ہے جن میں کسی ایک مذہب کے آراء و مسائل کو جمع کیا گیا ہے۔ اور ان میں مسائل کے ساتھ ساتھ اس کے مذہب کے اصول و مبادی کا تذکرہ بھی ہے۔ اور جہاں دلائل و شواہد کی ضرورت ہے، وہاں دلائل و شواہد بھی لائے گئے ہیں۔ اور حسبِ اقتضاء مخالف آراء پر تبصرہ و تنقید بھی کی گئی ہے۔ ہمارے علم میں اس نوع کا سب سے اعلیٰ نمونہ امام شافعی رحمہ اللہ کی کتاب الام ہے۔ اس عظیم القدر کتاب کا ایک اقتباس ہم امام محمد کی "الرد علیٰ اہل المدینۃ" کے ذکر میں آپ کے سامنے پیش کر چکے ہیں۔ اسی اقتباس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ امام شافعی رحمہ اللہ اپنے مسلک کے اثبات و احقاق میں اور اپنے اقوال کے دفاع میں کیا اسلوبِ بیان

اور طرزِ بحث اختیار کرتے ہیں۔

ساتویں اور آخری قسم کے دامن میں فقہ کا اصولی لٹریچر آتا ہے۔ یہ لٹریچر فلسفیانہ تعمق، فہم و بصیرت اور فکر و نظر کے ان تحیر خیز خزانوں سے عبارت ہے جنہیں مجتہدین اور فقہائے کرام نے علم اصولِ فقہ کے نام سے مرتب کیا ہے۔ اصولِ فقہ کی کتابوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر مذہب کے نزدیک شریعت کے ماخذ و مصادر کیا ہیں، اس کا طریقہ اجتہاد کیا ہے۔ اور وہ اصول و قواعد کیا ہیں جن پر اس کا اجتہاد مبنی ہے۔ اور دوسروں کے اجتہاد سے اسے ممتاز کرتا ہے۔ اور پھر ان اصولوں کی تشریح و توضیح میں احکام و مسائل بھی بکثرت ملتے ہیں۔ یہ شرف امام شافعیؒ کو حاصل ہے کہ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اس فن کی داغ بیل ڈالی اور اس پر باقاعدہ کتاب لکھی ہے یہ کتاب الرسالہ کے نام سے مشہور ہے امام شافعی رحمہ اللہ کے بعد اس فن کو بڑا عروج حاصل ہوا۔ علماء کا ایک گروہِ کثیر اس طرف متوجہ ہو گیا۔ اس کی ترتیب و تدوین میں بڑی عرق ریزیاں کی گئیں اور بالآخر یہ ارتقاء اور پختگی کے اس درجہ تک پہنچ گیا کہ اسے مستقل بالذات علم کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ اور بعد میں امت کے اہلِ علم میں اصولِ فقہ کے نام سے متداول رہا۔